غالب پر سہ روزہ سیمنار
(۱۸، ۱۹، ۲۰ دسمبر ۶۹ ۱۹ء)

خطبۂ صدارت

از

عالیجناب ایس۔ ایم۔ این، ترپاٹھی
سابق وائس چانسلر، سنسکرت یونیورسٹی بنارس

غالب سینٹری کمیٹی، گورکھپور یونی ورسٹی
گورکھپور

اربابِ علم، خواتین و حضرات!

غالب صدی کمیٹی کی طرف سے، یونی ورسٹی کی طرف سے اور اپنی طرف سے میں اس سیمنار میں شرکت کرنے والے مہمانوں کا دل سے استقبال کرتا ہوں، ہماری مہماں نوازی میں اگر کمی رہ گئی ہے تو میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ ہم وسائل سے عاری ہو سکتے ہیں، خلوص سے نہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے مہمان ہمارے ظاہر پر نہ جائیں گے، ہمارے جذبات کو محسوس کریں گے!

میں شروع میں اس سیمنار کے منتظمین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، میرے جذبۂ تشکر میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب میں اپنی کم مائیگی، نااہلی اور اس سیمنار کی صدارت کے لئے اپنی ناموزونیت پر نظر کرتا ہوں۔

آج ہم لوگ مرزا غالب پر سیمنار منعقد کر رہے ہیں۔ سیمناروں کا چلن کچھ زیادہ پُرانا نہیں۔ اس کے پہلے کسی موضوع پر اظہارِ خیال مباحثے کی شکل میں کیا جاتا تھا۔ مباحثے سے استدلالی قوت کو تو فروغ ہوتا ہے لیکن علم میں اضافہ کم ہی ہوتا ہے۔ چونکہ سیمناروں میں ایک ہی موضوع پر مختلف نقطۂ نظر کی نمائندگی ہوتی ہے اس لئے اس کے ذریعہ علم اور معلومات میں وسیع اضافہ ہوتا ہے۔ یونی ورسٹیوں میں صرف مباحثہ مناسب بھی نہیں ہے۔ کسی ایک موضوع پر یہاں تو طرح طرح کے نظریات کا اظہار ہی زیادہ اچھا ہے

——— اور پھر غالب کو تو مباحثے کا موضوع بنایا بھی نہیں جا سکتا۔ ان کی شاعری اور ان کی شخصیت پر مختلف نظریات پیش کیے جا سکتے ہیں اور یہ بات سیمنار ہی میں ممکن ہو سکتی ہے ——— اس طرح غالب پر اس سیمنار کی اور بھی اہمیت ہے۔

شاعرِ اعظم غالبؔ فارسی اور اُردو کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے اور اسی پایہ کے نثر نگار بھی تھے۔ انھیں ذکر زبان دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ فارسی کے عظیم شاعر ہونے کے باعث جب اُردو میں انھوں نے شعر کہنا شروع کیا تو اس میں بھی فارسی کے اثرات باقی رہے۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُردو ادب میں ان کا مقام بلند ہی نہیں بلند ترین ہے۔ انھیں اُردو کا تلسی داس یا سورداس کہا جا سکتا ہے۔ زبان پر انھیں اتنی قدرت تھی کہ مختصر الفاظ میں یہ بہت زیادہ مضامین ادا کر لیتے تھے۔ ان کی زبان سادہ اور آسان تھی۔ اس میں انفرادیت جامعیت اور دلکشی تھی۔ جذبات نگاری، استعارہ اور تشبیہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتی ہے۔

انھوں نے زندگی میں جو دُکھ سُکھ اُٹھایا تھا، اسے اپنی شاعری میں سمو دیا۔ کہیں اُمید کی جھلک ہے تو کہیں نااُمیدی، کہیں مسرت کی لہر ہے تو کہیں غم کے جذبات۔ غرض انھوں نے اپنی شاعری میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے جس سے ان کی شاعری میں اثر انگیزی اور دل آویزی آگئی۔

کبھی کبھی ان کی شاعری میں ایسے خیالات بھی راہ پا جاتے ہیں جن کو سمجھنا عام قاری یا سامع کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ کچھ خیال یہ الفاظ کے ذریعہ ظاہر کر دیتے ہیں اور کچھ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے کلام کی انھیں پیچیدگیوں کے پیشِ نظر ان کے ہم عصر شاعر آغا جان عیشؔ نے کہا تھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے\
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھے یا خدا سمجھے

پھر غالب کی شاعری کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ یہ ادق ہو کر بھی دلکش ہوتی ہے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا غالب کا موازنہ سنسکرت شاعروں بھوبھوتی یا اگھر سے کیا جا سکتا ہے۔ غالب کے اندازِ بیان کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ جو دقت پسندی اور قواعد میں جکڑی ہوئی ہے اور دوسری آسان و رواں، شگفتہ اور مضامین کی متانت اور سنجیدگی لئے ہوئے یہ دوسری قسم قارئین کے لئے سہل اور دلچسپ ہے ان کا طرزِ بیان ان کی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتا گیا۔ جس طرح ان کی ابتدائی زندگی آزادروی اور کھلنڈرے پن کی حامل تھی اُسی طرح ان کی ابتدائی شاعری بھی حقیقی دُنیا سے دور تھی۔ جیوں جیوں ان کی زندگی متنوع اور رنگا رنگ ہوتی گئی ان کی شاعری بھی حقیقت سے قریب اور آسان ہوتی گئی۔

اگر مرزا غالب کی شاعری کا مطالعہ ان کے الفاظ کی بندش، ان کی ترکیبوں کی نغمگی اور ان کے لب لہجہ کی روشنی میں کیا جائے تو وہ فنکاری کی تعریف پر پورے نہیں اُترتے۔ دراصل مرزا کی شاعری الفاظ، تراکیب اور بندشوں سے عبارت نہیں ہے۔ ان کی شاعری ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور اس کا مطالعہ اسی بات کو پیشِ نظر رکھ کر کرنا بھی چاہیئے۔ جب ہم ایسا کریں گے تو دیکھیں گے کہ فنکاروں میں اُنکا شمار سرِ فہرست ہے۔ مرزا کا تخیل زندگی کے حقائق سے موضوعات چُنتا ہے اور ان کی تشبیہیں اور ان کے استعارے مروجہ تشبیہوں اور استعاروں سے مختلف ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے ؎

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مفلس ہوتے ہوئے بھی مرزا کا جذبۂ خودداری بہت بلند تھا۔ ایک بار ان کو کسی انگریز افسر نے اونچی نوکری دینے کیلئے بلایا۔ جب آپ وہاں پہنچے تو چپراسی نے اُن کے پہنچنے کی اطلاع صاحب کو دی۔

افسر نے کہا کہ جا کر غالب صاحب کو ہمارا سلام پہنچا دو لیکن مرزا نے پالکی سے اپنا پیر باہر نہیں نکالا۔ بہت دیر ہو جانے پر صاحب نے چپراسی سے ان کے نہ آنے کی وجہ پوچھی، چپراسی نے جب مرزا صاحب سے افسر کے پاس نہ جانے کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ صاحب کو استقبال کے لئے میرے پاس آنا چاہیئے۔ چپراسی نے یہ بات صاحب بہادر سے کہہ دی وہ باہر نکلے اور مرزا کی پالکی کے پاس آئے اور ان سے کہنے لگے کہ چونکہ آپ نوکری کیلئے آئے ہیں اس لئے آپ اس اعزاز کے حقدار نہیں ہیں جو شاہی دربار کے درباری کی حیثیت سے آپ کو ملتا ہے مرزا صاحب نے جواب دیا میں سرکاری نوکری کو اپنی توقیر میں اضافہ سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ اُس کے لئے اپنے بزرگوں کی عزت بھی گنوانی پڑیگی اور یہ کہہ کر آپ وہاں سے چلے آئے۔

ان کی مفلسی اور بیکسی کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ انھوں نے ایک رشتہ دار کے بچے کے پیسے مانگنے پر کہا:

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

مرزا فرقہ وارانہ دیت سے بہت دور تھے۔ محبت ہی ان کا مذہب اور محبت ہی ان کا عمل تھا۔ ان کا کردار غیر مصنوعی اور زندگی آزاد تھی۔ آپ کا مذہبی عقیدہ منفرد تھا۔ ان پر باغی مسلمان ہونے کا الزام لگایا گیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا،

"عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو مسلمان نہیں۔"

ان کی نثر نگاری فنکاری کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے ثبوت میں ان کا یہ جملہ پیش کرنا کافی ہے:

"برسات میں چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔"

مرزا غالب کا اُردو اور فارسی شاعروں میں بلند ترین مقام ہے۔ ان کی شاعری کی جتنی بھی نشر و اشاعت ہو سکے کرنا چاہیئے تاکہ دوسری زبان کے لوگ بھی مستفید ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اس سیمینار کے ذریعہ اس مقصد کی ضرور تکمیل ہوگی۔ (تلخیص و ترجمہ)